آج کا استعمار

روجر وان زوان برگ*

ترجمہ: ڈاکٹر زاھد حسین

اس مقالے کا مقصد موجودہ دور کے استعماری نظام (Imperial System) کے طریقہ واردات کے بارے میں جاننا اور اس کی وضاحت کرنا ہے۔ آج کا استعمار ایک عالمی نظام (Global system) ہے۔ فکری طور پر اس کا سمجھنا اور سمجھانا اتنا آسان نہیں کیونکہ یہ ایک وسیع اور گنجلک معاملہ ہے اور اس کی کئی جہتیں اور پہلو ہیں۔

اس لیے یہ بہت ہی اہم ہے کہ اس سارے معاملے کا خاکہ قارئین کی نظر میں رہے۔ ان لوگوں کے لیے جن کی نگاہیں اپنی سرحدوں سے باہر پیش قدمی کی طرف لگی رہتی ہیں، اس سارے معاملے کو ایک استعماری نظام کے پس منظر میں دیکھنا اور بھی ضروری ہے کہ وہ کہاں کھڑے ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ آج کے استعمار کی حدود عالمی ہیں اس لیے دنیا میں موجود ہر شخص چار و ناچار اس سے متاثر ہو رہا ہے۔

یہ مقالہ خاص کر ان طالب علموں کے لیے اور بھی اہم ہے جنہیں عالمگیریت یا گلوبلائزیشن کے بارے میں کچھ نہیں پڑھایا جاتا۔ مغربی معاشیات میں اسے میکرو یو (Macro view) کہا جاتا ہے یعنی پوری دنیا کو ایک اکائی خیال کرنا اور جو کچھ بھی ہم دیکھتے یا سوچتے ہیں، کو اسی تناظر میں دیکھنا اور سمجھنا۔ مغربی عمرانیات یہ میں چیز بہت اہم سمجھی جاتی ہے لیکن ہمارے مذہبی نظام تعلیم میں دنیا کو اس تناظر سے دیکھنا کوئی آسان کام نہیں۔

ایک شخص صحرائے سہارا (Sahara) میں رہتا ہو یا دور کہیں افغانستان کے پہاڑوں میں، ایشیا کے گنجان شہروں میں ہو یا پھر افریقہ میں، استعمار اور سرمایہ دارانہ نظام سے کسی نہ کسی طور وہ ضرور متاثر ہوگا۔

*Roger van Zwanenberg, "Imperialism Today", *Policy Perspectives*, Islamabad, Vol. 1. No.1, April 2004, pp.31-44.

چاہے آپ منشیات کے دھندے کے لیے پوست کاشت کرتے ہوں یا امیروں کو ٹیکس سے بچانے کے لیے کاروں کا غیر قانونی کاروبار یا کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا تیار کردہ منرل واٹر استعمال کرتے ہوں۔ آپ کہیں بھی ہوں، آپ دنیا کو کنٹرول کرنے والی طاقتوں کے اثرات سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتے۔

اس طرح ہم بڑی طاقتوں کا آلہ کار بنتے ہیں چاہے ہم انہیں دیکھ سکیں یا نہیں۔ یہ بھی بدیہی حقیقت ہے کہ ہر ریاست میں موجود طبقہ اشرافیہ اور بڑی طاقتوں کی ملٹی نیشنل کمپنیاں آپ کے ملک کو ہر لمحہ اپنے کنٹرول میں کرتی جا رہی ہیں۔ اس لیے یہ مقالہ تمام انسانیت کو منسوب کیا جاتا ہے تاکہ وہ بڑی طاقتوں کے اس عالمگیر نظام کو سمجھ سکیں۔

استعماریت

اس کو سمجھنا بڑے غور و فکر کا متقاضی ہے۔ جس استعمار کا آج ہمیں سامنا ہے، دنیا کی سلطنتوں کی تاریخ کا یہ ایک حصہ ہے اور ان کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود تاریخ! لیکن آج کے استعمار کی کچھ باتیں خاص ہیں جو کہ پہلے کی کسی سلطنت اور استعمار کا حصہ نہیں رہیں۔

نو آبادیاتی تسلط، جو کہ استعماریت کا ایک اہم حصہ ہے، کو الگ سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کو استعماریت کے متبادل کے طور پر ہی استعمال کیا جانے لگا ہے۔ نو آبادیات بڑی طاقتوں کے تسلط اور غلبے کا ہی عمل ہے جو کہ کسی ملک کو اپنے مفاد میں یا تو براہ راست خود کنٹرول کرتی ہیں یا وہیں کے پٹھو حکمرانوں کے ذریعے۔ پچھلی دو صدیوں میں استعماری طاقتوں نے اپنے مفاد کے لیے نو آبادیات قائم کیں۔ ابھی حال ہی میں امریکہ کا عراق پر حملہ بھی اسی تسلسل کا حصہ ہے۔ اس لیے نو آبادیات کو استعماریت کی وسیع حکمت عملی کا ہی ایک حصہ سمجھنا چاہیے جو کہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے اور اس سارے عمل کو استعماریت ہی کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ پچھلی دو صدیوں میں بڑی طاقتوں نے دنیا کے وسائل کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے استعماری نظام کو پروان چڑھایا ہے ان کے مفادات خام مال سے لے کر نئی منڈیوں کی تلاش تک پھیلے ہوئے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ بدلتے اور ترقی کرتے رہتے ہیں۔

کچھ اہم نکات

چاہے ہم موجودہ استعمار کی بات کریں یا پچھلی دوصدیوں کے استعمار کی، کچھ نکات پر غور وفکر فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

۱۔استعماریت کے طریقے وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔اگرچہ استعماریت کی سرداری اب برطانیہ سے امریکہ کو منتقل ہو چکی ہے اور جو بذاتِ خود کوئی چھوٹی تبدیلی نہیں، پھر بھی اس کی بنیاد وہی سرمایہ دارانہ نظام ہے اور ابھی تک سرمایہ داریت اور استحصال ہی بڑی طاقتوں کے ہتھیار ہیں۔

۲۔استبدادی استعماریت میں بھی مسابقت ہوتی ہے۔جیسا کہ یہ ایک متحرک اور ہر لحہ بدلنے والا نظام ہے اس لیے جلد یا بدیر کوئی اور طاقت موجود الوقت استعمار کے مقابلے میں آ کھڑی ہوتی ہے۔۱۸۷۰ء میں جرمنی برطانیہ کا ہم پلہ ہونے کی تیاریاں کرنے لگا، پہلی جنگ عظیم (۱۸-۱۹۱۴ء) جرمنی کو زیر کرنے کی برطانوی کوشش تھی اور جس کا نتیجہ برعکس نکلا۔پھر روسی انقلاب نے سر اٹھایا اور امریکہ اور روس میں سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔اس جنگ کا خاتمہ ۱۹۸۹ء میں روس کی تباہی کی صورت میں ہوا۔

کیونکہ ابھی تک استعماری جدوجہد کے نشان راہ اتنے واضح نہیں کہ مستقبل کی کوئی پیش گوئی کی جاسکے (مصنف نے یہ مقالہ ۱۶ جنوری ۲۰۰۴ء کو آئی پی ایس میں پیش کیا تھا) تاہم چین کی اقتصادی ترقی کی ہوش ربا رفتار سے جائزہ لیا جاسکتا ہے کہ جلد ہی یہ امریکہ سے تصادم مول لے گا۔اس کے علاوہ بین الاقوامی سطح پر اسلام ایسا معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو امریکہ کو مطلوب ہے (یہ مصنف کی ذاتی رائے ہے عالمی منظر اس کی تائید کرتا نظر نہیں آتا۔مترجم)۔

مختلف قوموں اور معاشرتی نظاموں کے درمیان مسابقت موجودہ استعمار ہی کا ایک حصہ ہے۔

آج کے استعمار کی بنیادیں

اس غالب ہوتے نظام کی بنیادیں درج ذیل ہیں، ان کی تفصیل آگے آئے گی:

۱۔سرمایہ داریت یا عالمگیریت

۲۔مالیاتی تسلط

۳۔استعماریت،تجارت اور سرمایہ کاری کے روپ میں
۴۔سائنس وٹیکنالوجی
۵۔عسکری طاقت
۶۔نظریاتی کنٹرول

استعماریت کے غلبے کی جدوجہد،۱۸۱۵ء سے لے کر آج تک

۱۸۱۵ء میں واٹرلو (Waterloo) کے مقام پر نپولین کی برطانیہ کے ہاتھوں شکست کے بعد برطانیہ عالمی طاقت بن گیا۔اگلی ایک صدی برطانیہ کی تمام دنیا پر بادشاہت کی صدی تھی۔احساسِ برتری (Superiority complex) کی حامل برطانوی اشرافیہ نے اپنے خیالات کو پھیلانے اور تمام دنیا پر کنٹرول کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے مختلف اداروں کو وجود بخشا مثلاً صنعت وتجارت کے ادارے، سرمایہ کاری کے ادارے، مالیاتی اور عسکری قوت کے ادارے۔بیسویں صدی کے شروع تک برطانیہ دنیا کے سرمائے پر کنٹرول کے فوائد ٹیکنالوجی کی ترقی کی صورت میں حاصل کر چکا تھا اور برطانیہ کو روکنا دنیا کے ناممکنات میں شمار ہوتا تھا۔

تاہم صرف بیس سال یعنی پہلی جنگ عظیم کے بعد برطانیہ تھک چکا تھا اور اس کے سونے کے تمام ذخائر اور سرمایہ جنگ کے اخراجات کی مد میں امریکہ کو منتقل ہو چکا تھا اور اس کے لاکھوں جوان مارے جا چکے تھے۔اس جنگ سے پہلے جرمنی برطانیہ کے مقابل کے طور پر سامنے آیا اور اس جنگ کا مقصد جرمنی کا زور توڑنا اور برطانیہ کو مضبوط کرنا تھا۔نہ صرف یہ کہ ایسا نہ ہوا بلکہ الٹا روسی انقلاب برپا ہو گیا۔روسی انقلاب اس جنگ کے انتظار میں تھا یا نہیں یہ الگ بحث ہے، بہرحال جنگ عظیم نے اس عمل کو انگیخت ضرور کیا۔

اب اچانک نیا مدمقابل سامنے کھڑا تھا۔نئی روسی ریاست نے سرمایہ دارانہ نظام کو یکسر نظرانداز کر دیا اور تمام اداروں اور وسائل کو بغیر کسی معاوضے کے قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔سرمایہ داروں کے لیے آج تک اداروں کو قومی ملکیت میں لینے سے بڑا گناہ اور کوئی نہیں!روس اس ذہنیت اور نظام کے لیے ایک خطرہ تھا۔

بین الاقوامی سطح پر اس نئے خطرے کا عملی مظاہرہ دوسری جنگ عظیم تک سامنے نہ آیا۔ اس جنگ میں یورپیوں اور جاپانیوں نے جو کہ اس وقت کی بڑی سرمایہ دارانہ قوتیں تھیں، شکست کھائی اور لاکھوں جانیں ضائع ہوئیں۔ اس جنگ کے بعد امریکہ کو نہ صرف اپنی حیثیت کا احساس ہوا بلکہ وہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے بھی پوری طرح تیار ہو چکا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں برٹن وڈز (Bretton Woods) کے مقام پر ہونے والے معاہدے میں ایک نئے عالمی مالیاتی نظام کی بنیاد رکھی گئی اور اس میں برطانوی پاؤنڈ کی جگہ امریکی ڈالر کو متعارف کرایا گیا۔

۸۹-۱۹۴۴ء تک امریکہ نے ایٹمی جنگ سے بچنے اور اشتراکی روس کو تباہ و برباد کرنے کے لیے ہر حربہ آزمایا۔ ہر اس مطلق العنان حکمران کی حمایت کی گئی جس نے روس کے مقابل امریکہ کا ساتھ دیا چاہے وہ ڈکٹیٹر کتنا ہی بدعنوان کیوں نہ ہو۔ روس کو آخری دھچکا افغانستان میں لگا جب حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا کہ مغربی سرمایہ داریت سے بھی بڑا خطرہ روسی اشتراکیت ہے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی امریکی پیسے اور اسلحہ کا بہاؤ پاکستانی خفیہ ایجنسی کی طرف ہو گیا تاکہ وہ روس کے خلاف جہاد شروع کر سکے اور یہ حکمت عملی کامیاب رہی۔ پاکستان نے یہ کام اپنے نظریاتی پس منظر میں کیا تاہم اس کی قیمت بہت زیادہ دینی پڑی۔

۱۹۸۹ء میں امریکہ اکیلی عالمی طاقت کی صورت میں ابھرا اور لوگوں نے چہ میگوئیاں شروع کر دیں کہ آیا امریکہ بے ضرر ہی رہے گا؟ یہ سوالات ان لوگوں نے اٹھائے جو استعماریت کا مطلب نہیں سمجھتے تھے۔ استعماری طاقت چاہے کسی زمانے ہی کی کیوں نہ ہو دنیا کو کنٹرول کرنا چاہتی ہے۔ اپنی حکومتی اشرافیہ کو نوازنا چاہتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی چاہتی ہے کہ دنیا اس کو جانے اور اس سے ڈرے۔ آج کے دور میں کسی بھی عالمی طاقت کا بے ضرر اور معصوم ہونا عقل سے بعید ہے۔

چین سے ممکنہ خطرات ابھی خوابیدہ ہیں۔ اسلام سے امریکہ کو درپیش خطرے کی کئی جہتیں ہیں، بن لادن جو کہ افغانستان کے پہاڑوں میں کہیں روپوش ہو سکتا ہے یا پھر امریکی نوآبادی کو چیلنج جیسا کہ عراق میں ہو رہا ہے، یا پھر انقلابی اسلام کے دعویدار، اور وہ طاقتیں جو اسلامی قیادت کی تربیت کر رہی ہیں کہ مغرب سے آنے والی ہر چیز کو رد کر دیا جائے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کی طرف سے کوئی واضح او

رہا مقصد کردار سامنے نہیں آ رہا۔

سرمائے کا ارتکاز اور عالمگیریت

سرمایہ داروں کی رہنمائی میں اپنی سرحدوں کو وسیع کرتے ہوئے سامراج کا ایک تجزیہ کرتے ہیں۔ اس نظام کی روح منافع خوری اور دولت کا ارتکاز ہے اور پچھلی دو صدیوں میں تیز تر سائنسی ترقی اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے تمام دنیا کا سرمایہ سمٹ کر ایک بہت ہی قلیل گروہ کے ہاتھوں میں آ گیا ہے اور جو نسل در نسل انہی کے پاس ہے۔

ذاتی سرمایہ جمع کرنا اور اس کے ذریعے سیاسی طاقت حاصل کرنے کی خواہش ایک نشاط انگیز چیز ہے جس کی وضاحت محتاج بیان نہیں۔ اکیسویں صدی کے شروع میں چند لوگوں کے ہاتھ میں ناقابل یقین حد تک سرمائے کا ارتکاز ممکن ہو گیا ہے۔ ہماری دنیا بینکوں، تیل کی کمپنیوں، ڈیجیٹل کمپنیوں اور بنیادی ضروریات مثلاً پانی اور خوراک کی کمپنیوں سے بھر چکی ہے۔ یہ اس بڑھتی ہوئی دولت ہی کی کشش ہے کہ پچھلی دو صدیوں سے سرمایہ دارانہ استعماریت دنیا پر مسلط ہے۔

جیسے جیسے یہ کمپنیاں سرمائے کے حصول میں دنیا کے کونے کونے میں سرایت کر رہی ہیں اس کے ساتھ ہی ان کمپنیوں کے ممالک فوجی قوت کے ذریعے اس چیز کو ممکن بناتے ہیں کہ اقتصادی اور مالیاتی فضا ان کے حق میں رہے اور وہ بغیر کسی خوف کے نہ صرف اپنی مرضی سے سرمایہ کاری کر سکیں بلکہ سرمایہ کی آزادانہ نقل و حرکت بھی جاری رہے اور ان کو کسی برے نتیجے کا ذمہ دار بھی نہ ٹھہرایا جائے۔ پائیدار عالمی اقتصادی نظام، آزاد تجارت اور سرمائے کی آزادانہ منتقلی، یہ سب چیزیں سرمائے کے ارتکاز کے لے بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

''عالمگیریت'' کا لفظ آج کل سرمایہ دارانہ نظام کی جگہ استعمال ہونے لگا ہے۔ اس سارے عمل کا مقصد دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے مختلف اداروں (ورلڈ بنک، آئی ایم ایف، انشورنس کمپنیاں، دوساز ادارے) کو مضبوط بنانا ہے اور اس سارے عمل (گلوبلائزیشن) کے نتیجے میں ساری دنیا کی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں آ جاتی ہے۔

اس ارتکاز دولت کے عمل کو خود سامراجی قوموں اور ملکوں کے اندر بھی دیکھا جاسکتا ہے ہے جہاں تین چار بڑے ادارے ہی ساری دولت کے مالک بن جاتے ہیں اور چھوٹے اداروں کو مجبوراً بڑے اداروں میں ضم ہونا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر خود برطانیہ میں صرف چند کمپنیاں ہیں جو ۵۵ ملین لوگوں کی خوراک کا انتظام کر رہی ہیں۔ اسی طرح بقیہ یورپ اور شمالی امریکہ میں بھی یہی کچھ ہو رہا ہے اور یہی کچھ آئندہ چند سالوں میں ترقی پذیر ممالک میں بھی دیکھا جاسکے گا تاہم فی الوقت ترقی پذیر ممالک میں مختلف چھوٹے چھوٹے گروپ ایک ہی طرح کی چیزوں کی تجارت کرتے ہوئے ملیں گے۔

مغربی کمپنیوں پر عالمی تجارت کے لیے شدید دباؤ ہے کیونکہ ان کے اپنے ممالک میں تجارتی حجم پہلے ہی بڑی کمپنیوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر انہوں نے اپنے آپ کو زندہ رکھنا ہے تو لامحالہ ان کو اپنے ملکوں سے باہر کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ اس عمل کو ہی سرمایہ داریت (عالمگیریت) کہتے ہیں یعنی اپنے منافع کے لیے مستقل نئی منڈیوں کی تلاش۔

تمام وہ کمپنیاں جو اپنی سرحدوں سے باہر کام کر رہی ہیں، ہر وقت ایک خوف کی حالت میں ہیں کہ کہیں سوویت یونین کی طرح ان کو بھی قومی تحویل میں نہ لے لیا جائے۔ اس لیے اپنے تحفظ اور بچاؤ کے لیے وہ بڑے اداروں کی طرف رجوع کرتی ہیں جیسے عالمی بنک اور آئی ایم ایف۔ نتیجے کے طور پر آئی ایم ایف ان کے لیے مختلف ممالک میں سرمایہ کاری کی راہ ہموار کرتا ہے اور جب وہ مستحکم ہو جائیں تو انہیں قومی ملکیت میں لینے سے بچاتا ہے۔ جب وہ منافع کما لیتی ہیں تو اس منافع کی آزادانہ منتقلی کو بھی ممکن بناتا ہے چاہے اس سارے عمل سے اس ملک کی اقتصادی حالت پر کیسا ہی برا اثر پڑے (اس ضمن میں انڈونیشیا کی مثال قارئین کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔ مترجم)۔

جب یہ کمپنیاں ان ممالک میں قدم جما لیتی ہیں تو بین الاقوامی بنک اور کار کمپنیاں ان ممالک پر دھاوا بول دیتی ہیں اور لوگوں کی حرص اور لالچ کے قدرتی اور فطری احساسات سے مالی فائدہ اٹھاتی ہیں (آج کل پاکستان میں موجودہ کار فنانسنگ سکیمیں اسی تسلسل کا مظہر ہیں۔ مترجم)۔

امریکہ آج تمام دنیا میں سرمائے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والی کمپنیوں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے۔ ڈزنی کارپوریشن سے لے کر بل گیٹس مائیکروسافٹ تک تمام کمپنیوں کا حوصلہ بڑھاتا ہے تا کہ

وہ قومی حکومت کے شکنجے سے آزاد رہیں۔

سرمایہ داریت اور عالمی سرمائے کا ارتکاز ہی آج کے استعمار یعنی گلوبلائزیشن کی روح ہے۔ یہ ایک ایسا نظام ہے جو جہاں بھی جاتا ہے غریبوں کا ہی خون نچوڑتا ہے اور دولت صرف چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے۔ خود عالمی بنک نے تسلیم کیا ہے کہ پچھلے دس سالوں میں غربت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

یہ تمام حقائق سادہ مگر چشم کشا ہیں۔ بین الاقوامی اداروں کی مرہون منت ترقی، اپنے زورِ بازو سے کی گئی ترقی اور نشوونما کی کبھی بھی متبادل نہیں ہوسکتی۔

مالیاتی تسلط

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے سرمائے اور وسائل کے ارتکاز کے لیے کچھ بنیادی ضرورتیں ہوتی ہیں انہی میں سے ایک انتہائی اہم یعنی عالمی کرنسی کے نظام کی وضاحت کی جارہی ہے۔ میرے خیال میں جس چیز پر بہت کم غور وفکر کیا جاتا ہے وہ یہی کرنسی کا نظام ہے۔ پہلے اسٹرلنگ پاؤنڈ اور اب امریکی ڈالر کی ہماری عالمی تجارت کے اوپر حکمرانی ہے اور یہی استعماری کنٹرول کی علامت ہے۔ یہ کچھ بہت زیادہ پیچیدہ چیز بھی نہیں جس کو سمجھا نہ جاسکتا ہو۔ ہر وہ شخص جو کچھ بھی سوجھ بوجھ سے کام لے گا وہ اس نظام کی اصل کو پہچان جائے گا۔

پہلی بار برطانیہ نے ۱۸۴۴ء میں مرکزی بین الاقوامی بنک اور بین الاقوامی کرنسی کا نظام متعارف کرایا۔ یعنی مسٹرلنگ پاؤنڈ کو سونے کی ایک متعین مقدار کے متبادل قرار دیا۔ دوسرے لفظوں میں بینک آف انگلینڈ نے بین الاقوامی تجارت میں سٹرلنگ کے استعمال کی ضمانت اپنے سر لی۔ اور اس کا مطلب یہ تھا کہ بنک کے پاس ہر وقت اتنے سونے کی مقدار موجود رہنی چاہیے کہ وہ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں سٹرلنگ پاؤنڈ کو سہارا دے سکے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ برطانیہ کی تجارت ہمیشہ مثبت رہے یعنی برآمدات کا حجم درآمدات سے ہمیشہ زیادہ ہوتا کہ سونے کا بہاؤ ہمیشہ برطانیہ اور بنک آف انگلینڈ کی طرف رہے۔ نتیجہ کے طور پر پوری ایک صدی تک برطانیہ بین الاقوامی تجارت اور لندن دولت کا مرکز بنا رہا اور حکمران مزے اڑاتے رہے۔

تاہم یہ عظیم اور پرشکوہ عمارت پہلی جنگ عظیم میں ہی ایک جھٹکے سے زمین پر آ رہی کیونکہ یہ جنگ ان کی سوچوں سے کچھ زیادہ ہی سخت اور لمبے عرصے کے لیے جاری رہی اور برطانیہ کے سارے جنگی اخراجات امریکہ سے لیے گئے ادھار کے سہارے ادا کیے گئے۔ اگر چہ برطانیہ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس حالت سے نکلا جائے تاکہ عالمی حیثیت کو برقرار رکھا جا سکے مگر امریکہ نے جلد ہی اس خلا کو پُر کر دیا۔ جنگ عظیم نے برطانیہ کو بالکل لاغر کر دیا اس کی تمام دنیا پر پھیلی ہوئی عسکری طاقت ڈھیر ہوگئی۔

امریکہ اور امریکی ڈالر

ٹھیک سو سال بعد یعنی ۱۹۴۴ء میں برٹن وڈ معاہدے (Bretton Woods Agreement) کے تحت عالمی کرنسی کا نظام امریکی ہاتھوں میں منتقل ہوا اور سٹرلنگ کی جگہ امریکی ڈالر نظام کرنسی کے تحت پر جلوہ افروز ہوا اور تمام ممالک نے اس کو اپنا لیا۔

۱۹۷۱ء میں امریکہ نے یک طرفہ فیصلہ کیا کہ سونے کے تبادلہ کی جگہ دیگر کرنسیوں کو بھی عالمی نظام میں ڈالر کے مقابلہ پر لایا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مانگ اور کھپت کے لحاظ سے کسی بھی کرنسی کی قیمت کا تعین کیا جائے لیکن ڈالر بدستور اونچا رہا (کہ وہ عالمی طاقت کی کرنسی ہے)۔

جلد ہی امریکہ کو اپنے مرکزی بنک واقع نیویارک میں سونے کے ذخائر کی ضرورت نہ رہی یعنی تاریخ میں پہلی بار امریکہ کو اپنی درآمدات اور برآمدات میں توازن کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ ۱۹۷۱ء کے بعد جب بھی کسی ملک نے بہت سے ڈالر کما ڈالے تو امریکی خزانہ نے اس کو اس کے بدلے ایک امریکی بانڈ جاری کر دیا اور اس طرح باقی ممالک اپنے فالتو ڈالروں کے عوض امریکی بانڈز حاصل کرنے لگے۔ اس کے برعکس باقی تمام ممالک کو ہمیشہ ہی اپنی برآمدات و درآمدات میں توازن کی فکر دامن گیر رہی اور جب کبھی یہ توازن برقرار نہ رہ سکا تو ان ممالک کو اپنی معاشی حالت کو کنٹرول کرنے کے لیے بڑی ہی ناسازگار شرائط پر عالمی اداروں سے قرضے لینے پڑے۔

آج امریکہ اپنے پیسے کو دنیا میں کہیں بھی استعمال کر سکتا ہے۔ درحقیقت آج امریکہ کسی بھی ملک سے جنگ کر سکتا ہے ان ڈالروں کی بدولت جو اس نے باقی دنیا کے ممالک سے کمائے ہیں۔ دوسرے

لفظوں میں ہم خود اپنے اوپر مسلط جنگ میں امریکہ کے معاون اور مددگار ہیں۔

ایک سادہ سی مثال سے اس نظام کو سمجھنے میں بہت مدد مل سکتی ہے۔مثال کے طور پر میں نے ۱۰۰ ڈالر کمائے اور ۱۵۰ ڈالر خرچ کر دیے اور یہ ۵۰ ڈالر قرضے کے طور پر امریکی بانڈز کے ذریعے حاصل کیے اور پھر تجارت میں امریکہ ہی کو واپس کر دیے۔ ہے ناں حیرت انگیز نظام!!! لیکن پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ یہی موجودہ مالیاتی نظام امریکی استعمار کی کمزوری بھی ثابت ہوسکتا ہے۔اس کی وضاحت ذرا توقف کے ساتھ آگے آرہی ہے۔

موجودہ عالمی اور اقتصادی نظام آج کی بڑی طاقتوں کے مفادات کے گرد گھومتا ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز میں آج ہم ایک عجیب حالت سے دوچار ہیں جس میں اکیلے امریکہ کی درآمدات کا حجم اس کی برآمدات سے کہیں زیادہ ہے اور اس طرح وہ بغیر کسی خوف اور محنت کے اپنی پیداوار سے زیادہ مصنوعات استعمال کر رہا ہے۔ کچھ سطحی نظر رکھنے والے مبصرین شاید یہ دلیل دیں کہ اس طرح کی تجارت سے کمزور معیشت کے حامل ممالک کو ایک موقع مل جاتا ہے کہ وہ ایک طاقتور معیشت رکھنے والے ملک (امریکہ) میں تجارت کر سکتے ہیں۔لیکن یہ دلیل اس مفروضے پر مبنی ہے کہ شاید عالمی مالیاتی نظام ہمیشہ ایسے ہی چلتا رہے گا لیکن خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے ایسے نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر چین یا کوئی بھی دوسرے ممالک کا گروپ اگر یہ فیصلہ کرے کہ وہ اپنی ہی کرنسی میں تجارت کرے گا تو لازمی طور پر وہ ان تمام امریکی بانڈز کو بیچ ڈالے گا جو اس نے صرف تجارت کے مقصد کے لیے امریکہ سے حاصل کیے ہیں۔اس طرح امریکی معیشت میں ایک زلزلہ سا آجائے گا اور یہ شاندار اور ناقابل شکست نظر آنے والی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔اور خوش قسمتی سے اب دنیا میں اس بارے میں سوچا جانے لگا ہے اور اس کی عملی مثال یورو ہے۔

آزاد تجارت کے روپ میں نیا استعمار

تجارت اور بیرون ممالک میں سرمایہ کاری استعماری پالیسی کے دو بنیادی اجزاء اور عالمی سرمایہ داریت میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بااثر اور نمایاں استعماری ممالک نے آزاد تجارت کو ہمیشہ

تمام ممالک کے لیے مفید اور ایک اہم مقصد قرار دینے کی وکالت کی ہے اور اپنے زیر اثر کمزور معیشت کے ممالک پر اس کو بزور لاگو بھی کیا ہے۔

میرے قارئین کو اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیے اگر میں یہ کہوں کہ یہ تمام باتیں جھوٹ کا پلندہ ہیں اور حقیقت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن موثر عالمی ادارے ان باتوں کی تبلیغ اور وکالت ابھی تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آج کی تقریباً تمام ہی بڑی طاقتوں نے صنعتی ترقی محصولات کی دیواروں کی اوٹ (Behind the Tarrif Walls) لے کر ہی حاصل کی ہے۔ جاپانیوں نے ۱۸۶۰ء میں تقریباً چالیس سال کے لیے اپنے آپ کو عالمی تجارت اور عالمی استعماری طاقتوں سے الگ تھلگ رکھا۔ اسی طرح امریکہ نے بھی اپنی صنعتوں کو کیونکہ وہ بحرالکاہل (Atlantic Ocean) کو عبور کرنے کا خرچ اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ۱۹۴۵ء تک اپنی سرحدوں کو آزاد تجارت کے لیے بند رکھا۔ ۱۸۷۰ء میں شمالی اور جنوبی جرمنی نے اپنے آپ کو ممکن حد تک باقی دنیا سے الگ رکھا۔ اس دور میں جرمنی اور امریکہ کے دانشور فریڈرک لسٹ (Friedrick List) اور ڈینیل رے منڈ (Daniel Raymond) نے اپنی سرحدوں کو آزاد تجارت سے محفوظ رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔

اس لیے یہ سمجھنا بہت ہی آسان ہو جاتا ہے کہ بڑی طاقتیں آزاد تجارت کا نعرہ کب بلند کرتی ہیں؟ صرف اس وقت جب ان کی صنعتیں اتنی جدید ٹیکنالوجی استعمال کر رہی ہوتی ہیں جن کا مقابلہ کرنا کمزور ملکوں کی صنعتوں کے لیے ممکن نہیں ہوتا۔

اس سب کے باوجود آزاد تجارت میں بھی بڑی طاقتوں کے دوہرے معیار ہیں مثال کے طور پر یورپی یونین اور امریکہ خود تو زرعی پیداوار کی آزاد تجارت پر راضی نہیں لیکن باقی ممالک کو صنعتی پیداوار کی آزاد تجارت کا سبق خوب پڑھایا جاتا ہے۔

آج تمام طاقتور عالمی ادارے مثلاً عالمی بنک، عالمی مالیاتی فنڈ، عالمی ادارۂ تجارت، آزاد تجارت کے وکیل ہیں اور ان تمام اداروں کے پیچھے ایک نظر نہ آنے والی طاقت کارفرما ہے۔ جب بھی ایک ملک اپنی درآمدات و برآمدات میں توازن نہ رکھ سکنے کی وجہ سے مالیاتی مشکل میں آ پڑتا ہے تو یہ عالمی ادارے

کمزور ممالک کو آزاد تجارت کی راہ دکھاتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ اس کی وجہ سے آپ کی معیشت ترقی کرے گی اور ملک طاقتور ہو جائے گا۔

۶۰ء اور ۷۰ء کی دہائیوں میں جب آزاد تجارت کو کوئی نہیں جانتا تھا تو اس وقت عالمی معاشی نظام کی نمو ۳ فیصد اور علاقائی معیشت کی نمو ۳-۲ فیصد تھی۔ اس کے برعکس ۸۰ء اور ۹۰ء کی دہائیوں میں جب آزاد تجارت شروع ہوئی، عالمی معاشی نمو کم ہو کر ۲ فیصد جبکہ علاقائی معیشت میں اس سے بھی نمایاں کمی ہوئی۔ مثال کے طور پر لاطینی امریکہ ۰ء۶ فیصد، براعظم افریقہ ۰ء۷ فیصد، مشرق وسطیٰ ۰ء۲ فیصد۔ یوں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ آزاد تجارت عالمی اور علاقائی معیشت کے لیے کتنی مفید ہے؟ لیکن آزاد تجارت کے نعرے، ہماری آنے والی زندگی کے کئی سالوں تک ہمارے ساتھ ہی رہیں گے اور اس کے مفید ہونے کے دلائل بھی عالمی ہوتے جائیں گے۔

پچھلے ۲۵ سالوں میں اگر کسی ملک میں سالانہ معیشت میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے تو وہ چین ہے اور اس کے تمام اشاریے مثبت ہی رہے۔ اس وجہ سے آزاد تجارت کے لیے اپنی سرحدوں کو کھولنے کا دباؤ اس پر کارگر ثابت نہ ہوا اور اس طرح اس نے بڑی استعماری طاقتوں کی نصیحتوں پر کان نہیں دھرے۔

آخر میں مجھے آپ کو ٹرپس (Trips) کے بارے میں بتانا ہے یہ Trade related intellectual properties کا مخفف ہے۔ یہ ایک نئی اصطلاح ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس مضمون کے شروع میں میرا نام لکھا ہوا ہے، جو مجھے اس کا مالک بناتا ہے اور اس کی وجہ سے مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں کسی کو اس کے چھاپنے کی اجازت دوں یا نہ دوں۔ مصنفین کا یہ حق عالمی سطح پر جانا جاتا ہے اور یہ ایک باقاعدہ قانون بن چکا ہے۔

ملکیت کے اس حق کو اب دوسری چیزوں تک پھیلا دیا گیا ہے مثلاً ڈیجیٹل کی دنیا۔ اس طرح ایک عالمی مافیا وجود میں آ چکا ہے۔ اب یہ حق تمام ادویہ ساز کمپنیوں کو بھی حاصل ہو گیا ہے اور اکثریت میں یہ کمپنیاں امریکی ہیں۔ آزاد تجارت غریب ممالک کے گرد پھیلایا گیا ایک جال ہے اور اس کا سرا TRIPs کی صورت میں عالمی استعماری طاقتوں کے ہاتھ میں ہے۔

استعمار، سائنس وٹیکنالوجی

استعماری نظام کے پیچھے محرک قوت نئی ٹیکنالوجی ہے۔ منافع خوری، روپے کا ارتکاز اور نئی ٹیکنالوجی پر قبضہ آج کے استعمار کو پچھلی عالمی سلطنتوں اور استعمار سے جداگانہ حیثیت دیتا ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے مجھے کچھ مثالوں سے ان تبدیلیوں کا تذکرہ کرنا پڑے گا جو ماضی قریب میں واقع ہو چکی ہیں اور جو پچھلی نسلوں کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھیں۔ مثال کے طور پر

i۔ سٹیم انجن: سٹیم انجن انگلینڈ کی ان کانوں سے پانی نکالنے کے لیے بنایا گیا تھا جو کوئلہ نکالنے کی وجہ سے روز بروز گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ پہیے کی ایجاد اور پٹڑیوں کے منظر عام پر آنے سے موجود ٹرین منظر عام پر آئی۔ ذرائع نقل وحمل میں ایک انقلاب آ چکا ہے۔

ii۔ بجلی: بجلی کی ایجاد سے دن کا درانیہ ۲۴ گھنٹے ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے دن اور رات کا حساب ہوتا تھا لیکن اب ۲۴ گھنٹے کام ہونے لگا ہے۔

iii۔ اسلحہ سازی: اسی طرح اسلحہ سازی میں بھی انقلاب آ گیا ہے۔ بڑی استعماری طاقتوں نے بہت پہلے اس حقیقت کا ادراک کر لیا تھا کہ اسلحہ سازی میں تحقیق اور نئے اسلحے کی پیداوار کا نتیجہ عالمی تسلط اور غلبہ ہے۔

iv۔ میزائل سازی اور ایٹمی طاقت: یہ موجودہ دور میں اسلحہ کی جدید ترین اور مہلک ترین شکل ہیں۔ میزائلوں کے ذریعے سینکڑوں میل دور سے ہی اپنے ہدف کو آسانی کے ساتھ اور نتیجہ خیز طور پر نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔

سائنس اور نئی ٹیکنالوجی استعماری نظام میں مرکزی حیثیت رکھتے ہیں اور موجودہ عالمی تسلط میں ان کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے۔

ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اگر کمزور ممالک بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کریں تو ان کے ساتھ کیسا سلوک ہو سکتا ہے۔ بڑی طاقتیں ان ہتھیاروں پر صرف اپنا استحقاق رکھنا چاہتی ہیں کیونکہ اس کے بغیر وہ چھوٹے ممالک کو بغیر کسی مزاحمتی خوف کے ڈرا دھمکا نہیں سکتیں۔ شمالی کوریا، ایران اور عراق کا معاملہ ہمارے سامنے ہے اور اس کے بعد شاید پاکستان۔ یہی ہتھیار

اسرائیل کے پاس بھی ہیں مگر امریکہ اس سے چشم پوشی کر لیتا ہے کیوں؟ اس لیے کہ امریکہ اسرائیل کو اپنی استعمارانہ پالیسی کے پھیلاؤ میں فرنٹ لائن سٹیٹ اور تزویراتی طور پر (strategically) اپنا ہی حصہ خیال کرتا ہے۔

ٹیکنالوجی، ترقی اور استعماریت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ اور یہ بدیہی حقیقت بن چکی ہے کہ جب تک سائنس کے ہر ہر شعبے میں ترقی اور مغربی ٹیکنالوجی سے ہم اپنے آپ کو آراستہ نہیں کر لیتے، استعماریت کی مزاحمت صرف ایک خواب ہی رہے گا۔ اس سلسلے میں ہماری حالت ۱۸۶۰ء کے جاپانیوں سے مختلف نہیں!

سائنس اور ٹیکنالوجی اگرچہ مغربی تسلط میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن یہ ہمارے لیے بھی ایک بنیادی اور ضروری چیز ہیں۔

فوجی طاقت اور استعماریت

پچھلے دو سو سالوں کی زمینی اور بحری فوجی طاقت میں کچھ دہائیوں سے فضائیہ کا اضافہ ہو چکا ہے اور موجودہ دور میں خلائی ٹیکنالوجی اور برتری اس کے علاوہ ہے۔

دو تہائی دنیا پر مغربی طاقتوں کا تسلط زبردست گولہ بارود کی طاقت کا مظہر تھا۔ اس احساس خوف کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۸۰ء میں تقریباً تمام ہی نوآبادیات بغیر کسی جنگ کے قائم ہو گئیں۔ میری محتاط رائے یہ ہے کہ اس سو سال کی غلامی کے بعد اب تیسری دنیا کے لوگ مغربی اجارہ داری کے طور طریقوں کو اچھی طرح جان چکے ہیں اور انہیں یہ بھی علم ہے کہ مغربی اجارہ داری کے قائم اور باقی رکھنے کے مختلف حیلوں اور طریقوں کی کامیاب مزاحمت کیسے کی جا سکتی ہے۔

فوجی مزاحمت

مغرب کے فوجی غلبے کے توڑ کے لیے مختلف حکمت عملیاں ۶۰ سال تک عالمی سیاسی منظر نامے کا حصہ رہیں۔ ماؤ کی کامیاب گوریلا حکمت عملی کو دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی آزمایا گیا ہے۔ ابھی

جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں، نیپالی گوریلا کارروائیاں اس حد تک کامیاب ہیں کہ وہ اپنی حکومت کو گرا سکیں۔

ان گوریلا کارروائیوں پر امریکہ اور برطانیہ نے مل کر قابو پایا۔ اس کے لیے ان دونوں ممالک نے متعلقہ حکومتوں کے ساتھ مل کر بڑے پیمانے پر تشدد اور دہشت گردی کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ گوریلا کارروائیوں کا سدباب کرنا مغربی فوجوں کی تربیت کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ کینیا میں ماؤ تحریک کو برطانیہ نے بڑی بے دردی سے کچل دیا۔ امریکی ایئر فورس نے ویت نام اور کمبوڈیا میں شدید ترین کارپٹ بمباری کی، اسی طرح وسطی امریکہ میں ہزاروں لوگوں کو لڑائی کے دوران قتل کر دیا گیا۔ اس کے لیے امریکہ نے نہ صرف ہتھیار اور تربیت فراہم کی بلکہ اس نے مقامی طاقتوں کو دہشت گردی کی کھلی اجازت بھی دی۔

فوجی اجارہ داری میں جو چیز اسلحہ و گولہ بارود اور مضبوط دفاعی حکمت عملیوں سے بھی بڑھ کر اہم ہوتی ہے وہ جاسوسی کا نظام ہے۔ بہت کم لوگ ایکی لون (Echelon) کے بارے میں جانتے ہیں۔ یہ وہ آلہ ہے جس کے ذریعے نہ صرف ٹیلی فون نظام کی جاسوسی کی جاتی ہے بلکہ اس کے ذریعے میل اور فیکس کو بھی چیک کیا جاتا ہے۔ اس میں زمینی نظام کے ساتھ ساتھ خلائی ٹیکنالوجی کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ الیکٹرانک جاسوسی میں یہ چیز آج تک حتمی سمجھی جاتی ہے۔

یہ نظام برطانیہ کی ان کوششوں کا ثمر ہے جو اس نے جرمنی کی آبدوزوں کی نشان دہی کے لیے دوسری جنگ عظیم میں کیں۔ اس وقت سے امریکہ اور برطانیہ بڑی رازداری سے ایک خطیر رقم اس جاسوسی کے نظام میں خرچ کر چکی ہیں۔ یہ دونوں طاقتیں دنیا پر موجود ہر شخص کو سن سکتی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ امریکہ کے اڈے دنیا کے گرد موجود ہیں اور سب سے پہلا کام جو وہ کرتے ہیں یہی ہے کہ جاسوسی کے لیے اپنے مخصوص آلات کا رابطہ اپنے مرکزی دفاتر، جو امریکہ اور برطانیہ میں ہیں، کے ساتھ استوار کریں۔

امریکہ کے فوجی اڈے وسطی ایشیا، مغربی چین، بحیرہ کیسپین کے گرد اور جنوبی یورپ تک پھیلے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ بلا وجہ اور بلا ارادہ نہیں بلکہ ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت ہے۔ ان کا بڑا مقصد متعلقہ ممالک اور علاقوں کی جاسوسی اور ان پر اپنا کنٹرول مضبوط رکھنا ہے۔

امریکی فوجی اجارہ داری کو شدید دھچکا ان بین الاقوامی معاہدات سے لگ سکتا ہے جن کا ظہور سرد جنگ کے زمانے میں ہوا۔ جیسا کہ اب روس عالمی منظرنامے پر عالمی طاقت کے طور پر موجود نہیں ہے۔
درج ذیل بین الاقوامی معاہدے امریکہ پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔

۱۔سی ٹی بی ٹی
۲۔انٹرنیشنل کریمنل کورٹ
۳۔اینٹی بلاسٹک میزائل ٹریٹی
۴۔ہتھیاروں کی نقل وحرکت کو کنٹرول کرنے کے لیے امریکی تجاویز
۵۔خلا کو ہتھیاروں سے پاک رکھنے کا عزم
۶۔کیوٹو پروٹوکول
۷۔حیاتیاتی اور زہریلے ہتھیاروں پر کنٹرول

یہ ہیں وہ چند اقدامات جو امریکہ نے روس کو کنٹرول کرنے کے لیے بین الاقوامی سطح پر کیے مگر اب حالات بدل چکے ہیں اور کسی بھی چھوٹی ریاست کے لیے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ امریکی خواہشات کے برخلاف کچھ سوچ سکے۔

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اتنے ہتھیار کا ذخیرہ کس لیے، صرف امریکہ کی ساری دنیا پر بلاشرکت غیرے اجارہ داری کیوں؟ امریکہ کا تنہا اپنے آپ کو ساری کائنات کا مالک سمجھنا کس لیے؟ کیا یہ سب یونہی ہے؟

استعمار اور نظریات

تمام ہی سلطنتوں کو ایک نظریے اور سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ خاص طور پر ایک استعماری نظریے کی تاکہ وہ اپنے ظلم کو لبادہ دے سکے اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عوام کو بھی مطمئن کر سکے۔

دوسری طرف استعماری ممالک کی اشرافیہ کے پاس دولت کے وسیع انبار ہوتے ہیں اور وہ لوگ جن کے ہاتھ میں استعمار کی باگ ڈور ہوتی ہے اپنے نظریات کے بودے پن کو بخوبی جانتے ہیں اس لیے اپنے

آپ کو اپنے عوام کے سامنے قانون اور انصاف کا علمبردار ظاہر کرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے مفتوحہ اور مغلوب علاقے کے لوگوں کو جھوٹا، ذلیل، اخلاقی طور پر ناقابل بھروسہ اور تشدد پسند ظاہر کرنا ہوتا ہے۔

اگر ہم برطانیہ کے نظریے کا تجزیہ کریں جو اس نے اپنے عالمی استعمار کے دوران پیش کیا تھا تو ہمیں اسی سچائی کی جھلک نظر آئے گی جو ابھی میں نے اوپر بیان کی ہے۔کوئی بھی انصاف پسند شخص آج اس نظریے کو سچ نہیں مانے گا لیکن اس نظریے نے برسوں برطانیہ کو عالمی استعماریت کا اخلاقی جواز فراہم کیے رکھا۔اس نظریے کی بنیادیں برطانوی قومیت، بادشاہت، نسلی برتری، تہذیب اور مذہبی فوقیت پر رکھی گئی تھیں اور اس کے لیے بڑے عمدہ الفاظ کا سہارا لیا گیا تھا۔نسلی برتری اور احساس تفاخر پر قائم یہ اونچی عمارت ۱۹۴۵ء میں ختم ہوگئی۔اس نظریے کی فسطائیت کا بدترین مظاہرہ دوسری جنگ عظیم میں یہودیوں کی نسل کشی کی صورت میں ہوا۔

آج دنیا میں پرانے نوآبادیاتی دور کے نظریات کا چاہنے والا کوئی نہیں مگر ایک وقت تھا کہ اس نظریے کو ایک ''ابدی سچائی'' کا مقام حاصل تھا۔امریکی استعماری نظریات نے برطانیہ کی جگہ لے لی ہے۔ اس میں بہت کچھ مشترک ہونے کے باوجود خاصا اختلاف بھی نظر آتا ہے۔سب سے اہم بات امریکی لوگوں کا اس نظریے پر ایمان ہے چاہے وہ کہیں بھی رہتا ہو۔

اس نظریے میں بھی برطانیہ کے نظریے کی طرح قومیت کا تصور بہت واضح ہے۔لیکن امریکی جھنڈے، اخلاقیات اور تہذیب کی جگہ ''آزادی'' (Liberty) اور ''جمہوریت'' (Democracy) کے ساتھ ساتھ ''دہشت گردی'' (Terrorism) نے لے لی ہے۔امریکہ سے باہر بیٹھے امریکی اس بات کا تو بڑا چرچا کرتے ہیں کہ افغانوں نے جمہوریت کو قبول کر لیا ہے لیکن اگر وہ جمہوریت کا مطلب واقعی سمجھتے ہیں تو کیا وہ خود اس جمہوریت کے کاربند ہیں؟

چلیے اسی ایک نکتے یعنی جمہوریت پر بات کرتے ہیں اور اس کی سچائی کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔میرے خیال میں سرمایہ دارانہ معیشت میں لوگوں کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ ایک مثالی نظام ہے لیکن جب کبھی کوئی سیاسی جماعت جمہوریت کو ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے نظام کی تبدیلی کی

بات کرتی ہے اور سوشلسٹ یا اسلامی حکومت بنانا چاہتی ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس چیز کو امریکہ اپنی اشیر باد کے تحت انہی ملکوں کی مقامی فوج کے ذریعے کچل دے گا۔ مثال کے طور پر چلی (Chille)، اسی طرح الجیریا (Algeria) جہاں الیکشن کو ملتوی کر دیا گیا ہے کیوں کہ وہاں کی فوج کو خطرہ تھا کہ اسلام پسند گروہ اقتدار حاصل کر لے گا۔

اب ذرا امریکی صدر کو منصب صدارت پر براجمان کرنے والے ووٹوں کا تناسب ملاحظہ ہو:

۱۔ ۲۵ فیصد لوگوں کو سرے سے ووٹ کا حق ہی حاصل نہیں۔

۲۔ باقی ۷۵ فیصد میں سے صرف ۵۰ فیصد ووٹ کا حق استعمال کرتے ہیں۔

۳۔ اگر صدارتی امیدوار دو ہوں تو بالغ ووٹوں کا ۱۸ فیصد امیدوار کو صدر کے منصب پر فائز کرتا ہے اور اگر امیدوار ۳ ہوں تو یہ تناسب صرف ۱۴ فیصد رہ جاتا ہے۔

یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد آپ اپنا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ یہ ہے وہ مثالی نظام جو امریکہ باقی دنیا میں بھی نافذ دیکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ ہے وہ مہذب سماج (Civilised society) جس کا ڈھنڈورا ساری دنیا میں پیٹا جاتا ہے اور یہ ہے اس نظریے کی حقیقت جس کی وجہ سے امریکہ نے عراق پر حملہ کیا!!!

کیا امریکہ جھوٹ بول رہا ہے یا وہ واقعی جمہوریت پر ایمان رکھتا ہے؟

امریکی استعمار کی ایک اپنی الگ ہی منطق ہے۔ ان کے آباؤ اجداد جو ۱۶۲۰ء میں نیو انگلینڈ پہنچے (یعنی امریکہ) اور جنہوں نے اسرائیلی روایات اور بائبل کے قدیم نسخے سے ایک مفروضہ اپنے لیے اخذ کر لیا کہ وہ اپنے خدا کے لیے نئے اسرائیل میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ سرزمین ''زمین موعودہ'' ہے اور یہ حقیقت کہ انہوں نے اٹلانٹک عبور کر لیا ہے، ظاہر کرتی ہے کہ وہ خدا کے ''خاص بندے'' ہیں۔ امریکہ سے باہر رہنے والے لوگ شاید اس حقیقت کا یقین نہ کریں لیکن لاکھوں امریکیوں کا یہ ایمان ہے کہ دنیا کے لیے ان کے پاس ایک ''خاص مشن'' ہے اور یہ ''صالحیت'' جس کا اظہار موجودہ صدر امریکہ سے ہوا ہے (افغانستان اور عراق پر امریکی حملے کی طرف اشارہ ہے) لاکھوں لوگوں کی دل کی آواز ہے۔

اس طرح ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ ہر استعماری نظریے کی اس قوم پرستی میں ایک خاص اہمیت ہوتی ہے۔ لیکن جب اس نظریے کو باقی دنیا کے لوگوں پر بھی لاگو کیا جائے تو وہ صرف ایک جھوٹ بن کر رہ جاتا ہے۔

آج کل پبلک ریلیشنز کمپنیاں شعوری طور پر ایسے تصورات سامنے لاتی ہیں جس کے ذریعے وہ رائے عامہ کی ذہن سازی کر سکیں اور عالمی استعمار کے پھیلاؤ کو فروغ دے سکیں۔ کچھ نئے نظریات اور ان کے امریکی معنی یہ ہیں:

فقرے	امریکی مطلب
حکومتوں کی تبدیلی	فوجی قبضہ
پیش بندی کی پالیسی	فوجی قبضہ
لڑائی کے محور	وہ ممالک جن کو ہم کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔
ڈراؤ اور دھمکاؤ	امریکہ کی دہشت گردی کے مختلف طریقے
دہشت گردی کے خلاف جنگ	نہ ختم ہونے والی ایسی جنگ جو دنیا میں کہیں بھی امریکی حملے کے لیے جواز فراہم کر سکے۔

موجودہ امریکی نظریات کے بارے میں آخری بات ان نظریات کا اخبارات اور ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذریعے تیز تر فروغ ہے۔ ٹیلی ویژن نیٹ ورکس بہت کم تعداد میں ہیں۔ مثال کے طور پر سرمائے کے ارتکاز کی بحث میں دیکھیے کہ ٹیلی ویژن اور اخبارات کی ملکیت چند ہاتھوں میں ہے اور یہ لوگ حکومت امریکہ کے معاون ہیں۔ یہ بالکل غیر حقیقت پسندانہ تجزیے پیش کرتے ہیں، اس کے باوجود امریکی انتظامیہ کو یقین کامل ہوتا ہے کہ ان کو قبول عام حاصل ہو جائے گا۔ ہوسکتا ہے امریکہ آزاد لوگوں کی سرزمین ہو لیکن مدت ہوئی کہ تقریر کی آزادی اور نظریات کا آزادانہ پرچار امریکی اخبارات اور ٹیلی ویژن سے غائب ہے۔

نتائج

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عالمی سرمایہ داریت اور عالمگیریت موجودہ استعمار کا جزو لاینفک ہے اور اس نظام کی کئی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے عالمگیریت یا امریکی اقدار کو غلبہ حاصل ہوتا جا رہا ہے۔

(i) ڈیجیٹل انفارمیشن نظام کی وجہ سے عالمی سرمایہ داریت (Global Capitalism) ایک متحرک قوت بن چکی ہے۔

(ii) یہ پیداوار کا اکیلا ذریعہ ہے اور اس کا اظہار کار انڈسٹری میں دیکھا جاسکتا ہے۔

(iii) مختلف خطے اور ممالک باہم مربوط ہو رہے ہیں جیسے یورپی یونین۔

(iv) ایک بین الاقوامی حاکم کلاس (Global Ruling Elite) وجود میں آچکی ہے۔ یہ نیم حکومتی اور زیادہ تر پرائیویٹ فورمز (forums) پر آپس میں ملتے ہیں اور ہمارے مختلف ایشوز پر فیصلہ کرتے ہیں۔ اس میں سرمایہ دار اور سیاسی زعماء سب شریک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر G-8، ڈیووس (Davos) اور بنڈربرگ (Binderberg) جیسے ادارے اور فورمز۔

(v) نئی ڈیجیٹل ٹیکنالوجی اپنے عروج پر ہے اور اس نے ہر چیز میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔

ہماری آج کی استعماری دنیا اپنے سے پہلے کے ہر استعمار سے ہر حوالے سے مختلف اور جداگانہ ہے۔ یہ ایک لادین (Secular) نظام ہے جس میں ہر چیز حتیٰ کہ اقدار (values) تک کو ایک جنس (commodity) یا اشیائے صرف کے درجے پر لا بٹھایا ہے۔ اخلاقیات، مذہب اور انسان کا فطرت کے ساتھ تعلق بھی ایک جنس ہے جو بیچا اور خریدا جاسکتا ہے۔ اس نظام میں علاج معالجہ بھی ایک کاروباری حیثیت رکھتا ہے اور دوسری بنیادی اشیاء سے بھی آپ اسی صورت متمتع ہو سکتے ہیں، اگر آپ کے پاس ان کو حاصل کرنے کی قوت یعنی پیسہ ہو۔ اس کے نتیجے کے طور پر اشیاء کی پیداوار اور ان کے استعمال کا ایک شدید استحصالی نظام (Exploitative System) سامنے آتا ہے جس کی مثال اس سے پہلے کسی دور میں نہیں ملتی۔ سب سے اہم تر بات یہ ہے کہ اس کی کوئی سرحد نہیں اور یہی عالمگیریت کا مفہوم ہے اور یہی آج کا استعمار ہے۔ (Policy Perspective، ج۱، عدد۱، اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۳۱-۴۴)

[ڈاکٹر روجروان زوان برگ برطانیہ کے معروف اشاعتی ادارے "پلوٹوپریس" کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں. نیروبی اور دارالسلام کی یونیورسٹیوں میں تاریخ پڑھا چکے ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں.]